اورینٹل کالج میگزین، جلد۹۸، شمارہ۱، مسلسل شمارہ:۳۶۷، سال ۲۰۲۳ء

ڈپٹی نذیر احمد کے سوانحی لیکچر کا تجزیاتی مطالعہ

امجد علی شاکر، پی ایچ ڈی
سابق پرنسپل، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور

AN ANALYTICAL STUDY OF
AUTOBIOGRAPHICAL LECTURE BY DEPUTY NAZIR AHMAD

Amjad Ali Shakir, PhD
Former Principal
Govt. Islamia College, Railway Lines, Lahore

Abstract

Deputy Nazir Ahmad was a prolific Urdu writer. He was a profound scholar and translator. Besides Urdu rendition of the Holy Quran, he ingeniously translated the Penal Code of India and Income Tax Act from English into Urdu. He was a very good orator and delivered speeches on different occasions. He used the term lecture for his speeches. These speeches have importance in different areas of our history and literature. The article is a detailed study of one of his lectures delivered at Delhi. This lecture illustrates his educational, academic and literary life. The lecture also provides a good understanding about educational life of the Muslims of India of that time. It offers firsthand knowledge of the administrative situation of the princely state of Hyderabad Deccan as well.

Keywords:
Deputy Nazir Ahmad, Translation of the Holy Quran, Penal Code of India, Incom Tax Act, Delhi, Hyderabad Deccan.

ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶ء- ۱۹۱۲ء) اردو زبان کے کثیر التصانیف لکھاری تھے۔ وہ نثر و نظم دونوں میں رواں تھے مگر نظم میں وہ ایسی تخلیقات نہ پیش کر سکے کہ انھیں بہ طور شاعر یاد کیا جاتا۔ انھیں بہ طور نثر نگار کے شہرت نصیب ہوئی اور وہ اردو کی ادبی تاریخ میں مستقلاً نام پیدا کر سکے۔ ان کی تصانیف کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ انھیں تین حیثیتوں سے بہت اہم خیال کیا جاتا ہے:

- ناول نگار
- مترجم قرآن اور دینی کتب کے مصنف
- انگریزی کتب خصوصاً قانونی کتب کے مترجم

ان تین حیثیات کے علاوہ وہ ایک مکتوب نگار بھی تھے، علمی کتب کے مصنف اور ایک بڑے مقرر بھی تھے۔ وہ اپنی تقریروں کو لیکچر کہتے تھے جنھیں وہ لکھ کر پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے یہ لیکچر اپنے دل چسپ انداز اسلوب کی خوبیوں کے حامل بھی ہیں اور اپنے عہد کے ہندوستان کے مسلم معاشرے، خصوصاً اشرافیہ کی علمی اور فکری سرگرمیوں کی بہت عمدہ تصویر بھی پیش کرتے ہیں۔ ان لیکچرز میں سرسید (۱۸۱۷۔۱۸۹۸ء) اور علی گڑھ کی بہت عمدہ تصویر ملتی ہے۔ مزید برآں اِن لیکچرز میں اُن کے تعلیمی، ادبی اور دینی افکار ملتے ہیں۔

ان کا ایک لیکچر ایک سے زیادہ حوالوں سے بہت اہم ہے۔ اس میں نذیر احمد کی تعلیمی، تصنیفی اور علمی زندگی کے ساتھ ہندوستان میں انگریزی انتظام کے ارتقا اور ۱۸۵۷ء سے قبل مسلمانوں کے دینی نظامِ تعلیم کی خوبیوں اور ان سے کہیں زیادہ خامیوں کی تفصیل ملتی ہے۔

نذیر احمد کے چوالیس لیکچرز کا مجموعہ دو جلدوں میں شائع ہوا مگر یہ ان کے تمام لیکچرز کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (۱۹۲۰۔۲۰۰۰ء) نے ان کے دو لیکچرز دریافت کیے جو فروری ۱۹۰۱ء اور فروری ۱۹۰۲ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں پیش کیے گئے۔ انھوں نے ان لیکچرز کے بارے میں لکھا ہے:

> "نذیر احمد کے یہ خطبات ان کے لیکچروں کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ انجمن حمایت اسلام کے ماہ وار رسالے شمارہ مئی ۱۹۰۱ء اور مئی ۱۹۰۲ء میں انجمن کی سالانہ رودادوں کے ساتھ دونوں لیکچر شائع ہو چکے ہیں۔"(۱)

زیرِ نظر لیکچر ۱۹۰۳ء کو دہلی میں دیا گیا جسے موسوم بہ درباری لیکچر کہا گیا ہے۔ اس کے تعارف میں یہ جملہ ملتا ہے:

"جس میں لیکچرار نے اپنی علمی لائف کے علاوہ اسلامی مذہبی تعلیم پر اپنی رائے ظاہر کی ہے۔"(۲)

اس لیکچر کے شروع میں نذیر احمد نے اپنی عادت کے موافق ایک منظوم قطعہ پیش کیا ہے۔ اس کے آخر میں بھی ایک قطعہ شامل کیا ہے۔ اس میں ابتدا کے قطعے کے علاوہ مولوی سید عبدالغفور شہباز کا ایک مخمس بھی شامل ہے۔ اس سے ان کی شاعری سے دل چسپی تو واضح ہوتی ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ شاعری کے بہ جائے زیادہ تر قافیہ بندی کرتے تھے۔ نذیر احمد کو خود بھی اس کا ادراک تھا۔ چناں چہ انھوں نے خود لکھا ہے:

تم اپنی نثر لو اور نظم کو چھوڑو نذیرؔ
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالیؔ و نعمانیؔ(۳)

ان دو جملوں کو صرف اس لیے شعر کہا جائے گا کہ یہ کسی بحر میں ہیں، ورنہ ان میں شعریت تو دُور دُور تک نہیں ہے۔ ان کی شاعری کا عمومی معیار ان دو مصرعوں جتنا برا بھی نہیں ہے۔ ان کی شاعری کا ذکر قومی شاعری کی تاریخ میں بہ ہر حال کرنا پڑے گا۔

نذیر احمد نے زیرِ نظر لیکچر میں اپنی تعلیم کے تین مدارج کا تذکرہ کیا ہے۔ اولاً ابتدائی تعلیم جو انھوں نے اپنے والد سے حاصل کی، ثانیاً ثانوی تعلیم جو مولانا نصر اللہ خاں (۱۲۹۹۔۱۳۲۷ھ) سے حاصل کی، ثالثاً اعلیٰ تعلیم جو دہلی میں حاصل ہوئی، رابعاً انگریزی زبان کی تحصیل۔ نذیر احمد نے ان چاروں مدارج کی تعلیم کی تفصیل بھی بیان کی ہے اور اس پر اپنا نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً وہ اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میں تو تعلیم کا اتنا ہی گناہ گار ہوں کہ۔۔۔ اب سے آدھی صدی پہلے گھر میں باپ سے پرانے قاعدے پر پڑھنا شروع کیا، سب سے پہلے قرآن پڑھا، مگر وہی طوطے کی طرح ۔۔۔ تاہم طوطے کی طرح کا پڑھنا خاص کر مسلمانوں کے بچوں کے لیے ضرور مفید ہے۔ قرآن کے پڑھنے سے حروفِ عربی کے مخارج پر ان کی زبان ٹوٹتی ہے جو اردو کی تکمیل کے

لیے ضروری ہے۔ کیوں کہ اردو میں عربی کے الفاظ اس کثرت سے رواج پاگئے ہیں کہ جس کو عربی نہیں آتی، وہ درستی کے ساتھ عربی الفاظ کو ادا نہیں کر سکتا۔"(۴)

نذیر احمد قرآن مجید کی تعلیم کی یہ افادیت بیان کرنے کے ساتھ قرآن مجید کی تعلیم کی شرعی اہمیت بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ افادی نقطۂ نظر سبھی رفقائے سرسید میں پایا جاتا ہے۔ اُنھوں نے فارسی کی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی اور ان سے متداول فارسی کتابیں پڑھیں۔ وہ اپنے والد کے تقویٰ اور اندازِ تدریس کی تحسین کرتے ہیں، مگر فارسی ادب کی کتابوں پر اخلاقی لحاظ سے سخت تنقید کرتے ہیں۔ ادب کو اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا یہ رویہ زیادہ وضاحت سے ان کے ناولوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نذیر احمد اپنے اساتذہ میں مولانا نصر اللہ خاں اور ان کی تعلیم و تدریس کو بہت اہم خیال کرتے ہیں۔ وہ ان کی تدریس کے بارے میں سراپا تحسین نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"انھوں نے (والد محترم) مجھ کو اپنی سرپرستی سے علیحدہ کر کے مولوی نصر اللہ خاں صاحب مرحوم و مغفور کے سپرد کر دیا۔ یہ بزرگ حسنِ اتفاق سے ان دنوں بجنور میں ڈپٹی کلیکٹر تھے جو میرا مولد نہیں، وطنِ اقامت نہیں، بلکہ وطنِ اصلی ہے۔ جاہ و حشمت، حکومت وجاہت علم و فضل، سیر چشمی، حلم و تواضع، شریعت و طریقت، اتنی صفتیں میں نے ڈپٹی صاحب کے سوائے کسی ایک شخص میں مجتمع نہیں دیکھیں اور اسی جامعیت کے اعتبار سے وہ فردِ روزگار تھے۔ جب میں نحو عربی میں شرح مُلّا تک، منطق میں میر قطبی تک، فلسفہ میں ذہبی تک پہنچا تو انھوں نے اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے والد کو بلا کر فرمایا کہ اب اس کو دہلی لے جاؤ، وہاں اس کا پڑھنا خوب ہے۔"(۵)

مولوی نصر اللہ ایک معروف عالم دین تھے اور مولانا احمد علی چریاکوٹی کے تلمیذِ ارشد تھے۔ رحمان علی (۱۸۲۹ـ۱۹۰۷ء) ان کے احوال کے بیان میں لکھتے ہیں:

"مولوی نصر اللہ خاں، خورجہ کے رہنے والے، خویشگی افغانوں کے قبیلہ سے تھے۔ ان کا (تاریخی نام) عبدالعلیم تھا۔ مولوی احمد علی چریاکوٹی وغیرہ علمائے زمانہ سے مروجہ رسوم علوم کی تکمیل کر کے کامل استعداد حاصل کی اور ہمیشہ علمی مشاغل میں مصروف رہتے، انگریزی سرکار میں ڈپٹی کلیکٹری کے عہدہ پر ممتاز تھے۔ اس حکومت سے پنشن پانے کے بعد نظام حیدرآباد کی حکومت نے صدر تعلقہ دار کے منصب پر سرفراز فرمایا۔ **ارشاد البلید**

فی اثبات التقلید، **شرح رباعیات یوسفی**(طب)، **شرح خلاصہ کیدانی** (فقہ)وغیرہ رسالے اُن کی تالیفات ہیں۔ ۱۲۹۹ھ / ۸۲-۱۸۸۱میں انتقال ہوا۔"(۶)

مولوی نصر اللہ خاں کا انتقال ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء میں بہ عمر ۷۲ سال ہوا، اس لیے ان کا سال ولادت ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ایک **تذکرہ الشعرا گلشن ہمیشہ بہار** کے نام سے مرتب کیا اور **تاریخ دکن** بھی لکھی۔ ان کی ملازمت اور علمی و ادبی زندگی سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری (۱۹۲۳۔۲۰۱۳ء)بعض معلومات یوں پیش کرتے ہیں:

"نصر اللہ خاں عربی فارسی کے فاضل تھے اور کئی دوسری زبانیں بھی جانتے تھے۔ سرکاری ملازم تھے اور ڈپٹی کلیکٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ بہ سلسلۂ ملازمت ان کا قیام مختلف مقامات پر رہا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد سرکاری ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرلی۔ کچھ دن کپور تھلہ رہے، پھر حیدر آباد چلے گئے۔۔۔ آخری عمر میں اپنے وطن خورجہ میں آکر مقیم رہے اور وہیں وفات پائی۔ ان سے متعدد تصانیف یادگار ہیں۔ یہ تصانیف اردو، فارسی، عربی اور ترکی چاروں زبانوں میں ہیں۔ ان میں **تذکرۂ گلشن ہمیشہ بہار** اور **تاریخ دکن** خاص طور پر شہرت رکھتی ہیں۔"(۷)

مولوی نصر اللہ خاں سے ڈپٹی صاحب کو بہت عقیدت تھی۔ ڈپٹی صاحب اپنے استاد کی طرح ڈپٹی کلیکٹر بھی بنے اور ادبی خدمات بھی سرانجام دیں۔ مولوی صاحب بعد کو بڑے ادیب اور مصنف بنے تو یقیناً اس کی ایک وجہ مولوی نصر اللہ سے تلمذ ہے۔ ان کی صحبت میں ڈپٹی صاحب کا ادبی ذوق پیدا ہوا۔ اسی طرح زبانیں سیکھنے کا ذوق بھی پیدا ہوا۔ چناں چہ بہت بعد میں ڈپٹی صاحب نے انگریزی زبان سیکھی اور اس میں مہارت حاصل کی۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے اساتذہ میں جس طرح مولوی نصر اللہ خاں کی مدح کی ہے، ویسے ہی اپنے بعض دہلوی اساتذہ کی قدح کی ہے جن کے پاس وہ مسجد میں بہ طور طالب علم مقیم تھے، اس مسجد کا نام اورنگ آبادی تھا۔ اس مسجد کے دارالعلوم میں قیام کے بارے میں اُن کے تاثرات بے حد منفی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"مجھ کو تو کسی مولوی نے نہ آپ پڑھایا اور نہ پڑھنے دیا۔ آپ نہیں پڑھایا تو خیر ایک بات ہے۔ شکایت تو اس بات کی ہے کہ پڑھنے بھی نہیں دیا۔ وہ اس طرح کہ مجھ جیسے کم عمر لڑکے

مولویوں کے زنان خانے میں جاتے تھے اور ان سے خدمت گاری کا کام لیا جاتا تھا۔ معاوضہ اس کا کہ مسجد میں رہتے تھے۔ پس ان کے لیے مسجد بھٹیاری کی سرائے تھی اور اس کا کرایہ مولوی اور مولونوں کی خدمت۔۔۔ میری ساری عمر میں وہ بدترین وقت تھا۔ اگر اس کو چار پانچ برس کا بھی امتداد ہو جاتا تو دنیا اور دین دونوں طرف سے تباہ ہو لیا تھا۔"(۸)

اکثر تذکرہ نویس اورنگ آبادی مسجد کے اساتذہ سے ان کے تلمّذ کا ذکر کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ بہ ہر حال نذیر احمد نے اس مسجد کے دارالعلوم کا تذکرہ جس انداز میں کیا ہے، اس سے وہاں کے ماحول کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے، بل کہ اس دور کی دینی تعلیم اور تعلیمی ماحول کی تفہیم بھی آسان ہو جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اب تو وہ محلے کا محلہ ریل میں آگیا ہے، مگر ۴۳،۱۸۴۲ء میں جب کا یہ مذکور ہے، پنجابی سوداگر اس میں آباد تھے۔ مسجد کا نام اورنگ آبادی تھا اور وہ ہر طرح سے فتح پوری مسجد کے مدِّ مقابل تھی۔ اس میں مختلف مقامات کے پچاس ساٹھ طالب علم مسافرانہ رہتے تھے۔ دونوں وقت پنجابیوں کے گھروں سے ٹکڑے مانگ لاتے اور آپس میں بانٹ کھاتے اور ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ اورنگ آبادی مسجد مولویوں کے ایک خاندان کی تولیت میں تھی۔ ان میں یہ اختلاف عقائد کی وجہ سے وہابی اور بدعتی دو گروہ تھے، ایک دوسرے کے دشمن۔ مسجد کے طالب علم بھی ان دو گروہوں میں منقسم تھے۔ میں تھالی کا بینگن مذہب، جدھر کچھ ملتا دیکھا، ادھر ہی کا ہو رہا۔"(۹)

اس مسجد میں چھے محرابیں تھیں۔ تین محرابیں ان لوگوں کے پاس تھیں جنھیں بدعتی کہا جاتا تھا۔ تین محرابیں مولوی عبدالخالق کے خاندان کے پاس تھیں۔ ایک محراب میں ان کے صاحب زادے مولوی عبدالقادر بیٹھتے تھے اور دوسری محراب میں حضرت میاں نذیر حسین (۱۸۱۰۔۱۹۰۲ء) تشریف رکھتے تھے۔ تیسری محراب میں بیٹھنے کے لیے خاندان سے کوئی اعلیٰ درجے کا استاد میسر نہیں تھا۔ افتخار عالم مارہروی کی تصنیف **حیات النذیر** میں یہ دعویٰ ملتا ہے کہ مولوی عبدالقادر نے نذیر احمد کو اس لیے اپنا داماد بنا لیا کہ تیسری محراب میں بیٹھنے کے لیے اعلیٰ درجے کا استاد میسر آ سکے، مگر ڈپٹی نذیر احمد نے کبھی وہاں بہ طور استاد نہ بیٹھنا تھا، نہ بیٹھے۔

یہ ۴۳۔ ۱۸۴۲ء کا قصہ ہے۔ یقیناً ۱۸۴۱ء میں بھی اس مسجد کا یہی ماحول تھا جب حضرت شاہ محمد اسحاق (۱۷۸۳۔ ۱۸۴۶ء) دہلی سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے تھے۔ اب یہ کہنا کہ حضرت شاہ محمد اسحاق جاتے ہوئے میاں نذیر حسین کو اپنا جانشین نام زد کر گئے، حال آں کہ اس وقت حضرت نواب قطب الدین (۱۸۰۴۔ ۱۸۷۲ء) اور حضرت شاہ عبدالغنی (۱۸۱۹۔ ۱۸۷۸ء) دہلی میں موجود تھے۔ حضرت نواب صاحب خاندانی اور علمی وجاہت دونوں سے بہرہ ور تھے۔ حضرت شاہ عبد الغنی، حضرت مرزا مظہر جان جاناں (۱۶۹۹۔ ۱۷۸۱ء) کی خانقاہ میں تشریف رکھتے تھے۔ انھیں علمی اور روحانی دونوں حوالوں سے مقبولیت حاصل تھی، لہٰذا ان کی موجودگی میں اورنگ آبادی مسجد کے مذکورہ ماحول میں رہنے والے کسی عالم کو جانشین قرار دینا قیاساً بھی درست نہیں۔ رہا روایتاً درست ہونا تو محمود احمد برکاتی (۱۹۲۴۔ ۲۰۱۳ء) اس روایت کی پُرزور طریقے سے تردید کر چکے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "شاہ محمد اسحاق نے اپنے سفر ہجرت کے وقت نہ میاں نذیر حسین کو اپنا خلیفہ بنایا نہ وہ اُس وقت اس کے اہل ہی تھے۔"(۱۰)

اس کی بہ جائے یہ کہنا درست ہے کہ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی نے ۱۲۵۸ھ میں دہلی سے ہجرت کرتے وقت آپ کو سندِ حدیث عطا فرمائی۔ ۱۹۴۲ء میں اورنگ آبادی مسجد میں تعلیم کا ماحول دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت میاں نذیر حسین کو ہندوستان بھر میں جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی، وہ بہت بعد کی بات ہے۔ یہ مقبولیت اُس وقت ہوئی جب دہلی سے حضرت شاہ احمد سعید، حضرت شاہ عبد الغنی مجددی مدینہ طیبہ کو ہجرت کر گئے اور نواب قطب الدین علیہ الرحمہ ۱۸۶۲ء میں وفات پا گئے اور دہلی میں سربر آوردہ علما میں سے صرف حضرت میاں نذیر حسین رہ گئے۔

ڈپٹی نذیر احمد کی آئندہ تعلیم دہلی کالج کی مرہونِ منت ہے۔ وہ اورنگ آبادی مسجد میں نہ تو تعلیم میں آگے بڑھ رہے تھے، نہ دینی اور اخلاقی تربیت ہی ہو رہی تھی۔ اچانک انھیں حسنِ اتفاق سے دلی کالج میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔

> "بارے ایک عجیب اتفاق سے میں دہلی کالج کی دوسری جماعت میں داخل ہو گیا۔ داخل ہوتے ہی مجھ کو وظیفہ ملنے لگا اور خدا نے مجھ کو مسجد کی گدایانہ زندگی سے نجات دی۔ کالج کی تعلیم کی ابتدا تھی کہ وطن میں والد کا انتقال ہو گیا۔ دو اڑھائی برس کی بڑائی چھٹائی سے وہ متقارب العمر لڑکوں کے وظیفوں پر آٹھ دس آدمیوں کی خانہ داری کے بوجھ کا پڑ جانا

> حقیقت میں مصیبت کے پہاڑ کا ٹوٹ پڑنا تھا۔۔۔ چناں چہ تحصیل علم کے میدان میں یا تو قدم بہ قدم چل رہا تھا یا اب لگا سرپٹ دوڑنے۔۔۔ باوجودے کہ خود مدرسے کی پڑھائی کا ایک انبار تھا۔ میں نے اُس وقت کے مشاہیر سے مدرسے کے علاوہ دو سبق اور شروع کر دیے۔ میرا اُن دنوں کا پڑھنا پڑھنا نہ تھا، بل کہ کتابوں کا پھانکنا تھا۔"(۱۱)

اس اقتباس میں دو باتیں قابلِ غور اور لائقِ اعتنا ہیں۔ ایک تو کالج میں داخلے کے سلسلے میں عجیب اتفاق اور دوسرے کالج سے باہر مشاہیر علما سے علم کی تحصیل۔ اس عجیب اتفاق کی تفصیل ڈپٹی نذیر کے شاگرد مرزا فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۳۔۱۹۴۷ء) نے **نذیر احمد کی کہانی** میں اور افتخار عالم مارہروی نے **حیات النذیر** میں بیان کی ہے۔ یہ واقعہ خاصا ڈرامائی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ کب ہوا؟ اس سلسلے میں مختلف آرا موجود ہیں۔ مثلاً افتخار عالم مارہروی نے داخلے کی تاریخ جنوری ۱۸۴۵ء بیان کی ہے، لیکن افتخار احمد صدیقی نے تحقیق کے بعد لکھا ہے:

> "دہلی کالج میں نذیر احمد کا داخلہ جنوری ۱۸۴۵ء کی بہ جائے جنوری ۱۸۴۶ء میں ہوا تھا۔ داخلے کے وقت ان کی عمر پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ تھی اور وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ ذہین و ہوش مند تھے۔"(۱۲)

اکرام چغتائی (۱۹۴۱۔۲۰۲۳ء) نے قدیم دہلی کالج کے نو دریافت ریکارڈ کے حوالے سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے ہیں:

> "یہ دستاویز دہلی کالج میں زیر تعلیم طلبہ کی فہرست ہے جو ۱۸۴۷ء کے سالانہ امتحان میں شامل ہوئے تھے۔ اس فہرست کے مطابق مولوی نذیر احمد کی عمر بارہ سال تھی۔ یوں ان کا سال ولادت ۱۸۳۵ء قرار پاتا ہے۔ متذکرہ صدر فہرست طلبہ (۱۸۴۷ء) میں اس کالج میں ان کی مدتِ تحصیل ایک سال تین ماہ مرقوم ہے۔ اس اعتبار سے وہ جنوری کے بہ جائے اکتوبر ۱۸۴۶ء میں داخل ہوئے۔"(۱۳)

اکرام چغتائی دستاویز سے یقیناً یہ نتیجہ نکالنے میں درست کہے جاسکتے ہیں، مگر یہ ماننا مشکل ہے کہ وہ ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے اور ۳۔۱۸۴۲ء میں دہلی آ گئے۔ گویا وہ اس وقت صرف سات آٹھ برس کے تھے جب وہ مولوی نصر اللہ خاں سے **میر قطبی**، **شرح ملا** اور **میبذی** پڑھ کر دہلی اعلیٰ تعلیم کے لیے چلے آئے۔ اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ سرکاری رجسٹر میں کسی وجہ سے اُن کی عمر غلط لکھی گئی۔ نذیر احمد کے

اقتباس میں کالج سے باہر مشاہیر علما سے تحصیل علم کی تفصیل معلوم کی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ کالج کے علاوہ کالج ہی کے ایک اُستاد مولانا مملوک علی (۱۷۸۹ـ۱۸۵۱ء) سے پڑھا کرتے تھے۔ مولانا بگھی پر کالج آتے اور نذیر احمد اُس کے پیچھے بھاگتے اور سبق پڑھتے۔ اُن کے علاوہ اُنھوں نے کس بزرگ سے استفادہ کیا، واضح نہیں۔

نذیر احمد نے دہلی کالج میں کیا پڑھا اور کیا نہ پڑھا اور کس مضمون کو عدم دل چسپی سے پڑھا، اس کی تفصیل وہ یوں بیان کرتے ہیں:

> "خدا عربی کا بھلا کرے کہ وہ ریاضی وغیرہ کی تلافی کرتی رہتی تھی اور یہ نہ ہوتا تو میں کسی طرح جماعت میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ پس مجھے بُرا بھلا جو کچھ بھی آتا ہے، میں اس کے لیے کالج سے بڑھ کر باہر کی پڑھائی کا شکر گزار ہوں۔۔۔بے مناسبتی کی وجہ سے میں نے سائنس کو شوق سے نہیں پڑھا، لیکن معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن، گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہادی اعلیٰ بصیرت۔۔۔ میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا، مولوی ہوتا، تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط۔"(۱۴)

نذیر احمد نے ۱۸۵۴ء میں دہلی کالج سے فراغت حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی اُن کی باقاعدہ اور رسمی تعلیم کا سلسلہ مکمل ہوا۔ انھوں نے دہلی کالج میں رہ کر انگریزی زبان کی تعلیم سے مکمل گریز کیا۔ اس کا سبب انھوں نے اپنے ایک لیکچر میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> "میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں۔ والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے، مگر اپنے وقت کے بڑے دین دار، صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مر جانا منظور، اس کا بھیک مانگنا قبول، مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں۔"(۱۵)

نذیر احمد نے اپنی تعلیم کے دوران میں تو انگریزی نہ پڑھنا تھی، نہ پڑھی، مگر ۱۸۵۷ء سے دو تین سال بعد جب وہ دوران ملازمت الٰہ آباد میں ڈپٹی عبد اللہ خاں کے ہاں مقیم تھے، انھوں نے انگریزی پڑھنے کا آغاز کیا۔ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ وہ عبد اللہ خاں کی بیٹھک میں رہتے تھے جو بے حد دین دار

تھے۔ انھیں دیکھ کر یہ یقین کیا جا سکتا تھا کہ زبان انگریزی کی تحصیل دین داری کے خلاف یا مضل نہیں ہو سکتی، مگر حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اب مدتوں انگریزوں کی حکومت قائم اور غالب رہے گی۔ آئندہ عزت سے زندگی کرنے کے لیے ضروری ہو گا کہ انگریزی سیکھی جائے۔ نذیر احمد نے، جو دنیوی ترقی کا جذبہ رکھتے تھے، حالات کو دیکھ کر انگریزی سیکھنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ انگریزی سیکھنے کا قصہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ”عبداللہ خاں مذہبی آدمی تو تھے ہی اکثر مجھ سے قرآن کی آیتوں اور دعاؤں کے معنی پوچھتے رہتے تھے۔ اب انھوں نے میری اتنی ذرا سی امداد کے صلے میں زیادہ اصرار کرنا شروع کیا اور کہا کہ میں تم کو چٹکی بجانے میں انگریزی سکھا دوں گا۔ غرض میں نے انگریزی پڑھنی شروع کی۔۔۔ سمال ٹائپ کی ”عریبین نائیٹس“ کے دس دس پندرہ پندرہ صفحے عبداللہ خاں سے دیکھ لیتا اور دورے میں اُن کو رٹا کرتا۔ شروع شروع میں تو انگریزی کے ہجوں سے ایک طرح کی وحشت ہوئی، مگر جب ہزار ڈیڑھ ہزار لفظ ذہن نشین ہو گئے تو میں انگلش ان ٹو اردو ڈکشنری کی مدد سے آسان آسان عبارتوں کا مطلب نکالنے لگا۔“(۱۶)

یوں نذیر احمد کا تحصیل علم کا سفر تمام ہوا۔ اس کے بعد وہ مترجم اور مصنف ہوئے اور تمام ہند پر اُن کے علم کی دھاک بیٹھ گئی۔ انھوں نے بغیر لگی لپٹی کے اپنا سفر تعلیم خود ہی بیان کر دیا۔ انھوں نے اپنے اساتذہ کے سلسلے میں نہ تو کسی قسم کا تکلف برتا ہے، نہ بے جا تحسین کی ہے۔ یہ لیکچر ۱۹۰۳ء کو ہوا تھا۔ اس وقت اورنگ آبادی مسجد کے اساتذہ میں سے اُن کے دادا سسر مولوی عبدالخالق اور میاں نذیر حسین (م۱۹۰۲ء) فوت ہو چکے تھے۔ یہاں ایک اور بات بھی بہت حیران کن ہے کہ وہ اسی لیکچر میں ۱۸۵۷ء کا ذکر کرتے ہیں تو اپنے سسر مولوی عبدالقادر اور میاں نذیر حسین کا ذکر انتہائی بے تکلفی سے کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ۱۸۵۷ء کے محاربے کے دنوں میں بہ سلسلۂ ملازمت کانپور میں مقیم تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو کہاں کی ملازمت اور کہاں کا انتظام، انھیں مجبوراً دہلی جانا پڑا جہاں اُن کی اہلیہ اپنے میکے میں مقیم تھیں۔ وہاں وہ دوران غدر میں مقیم رہے، مگر وہ اس لیکچر میں غدر کے حالات سے متعلق خاموش رہتے ہیں۔ صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

> ”مس لیسن کو مولویوں نے اپنے یہاں رکھ کر ان کی مرہم پٹی کی۔ تو انا تندرست ہوئیں تو دہلی کی فتح سے پہلے ان کو انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا۔ یہ خیر خواہی قطع نظر اس سے کہ ایسے

نازک اور خطرناک وقت میں مولویوں کے خاندان سے ہوئی اور ایسی رازداری کے ساتھ کہ ایک طرف مسجد میں جہادی بھرے پڑے تھے اور دوسری طرف ان کے پڑوس میں ایک لیڈی کئی مہینے ٹھہری رہی، اور اس کی ہوا تک نہ پھوٹی۔ اس خیر خواہی کی رازداری میں مولویوں کے خاندان کا بچہ بچہ شریک تھا۔"(۱۷)

اتنی بڑی خیر خواہی کا انعام سوائے اس کے کچھ نہ ملا کہ فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے کا جرم معاف ہوا اور ڈپٹی نذیر احمد اپنی نوکری پر بحال ہو گئے۔ وجہ مولویوں کے خاندان میں اختلاف ٹھہری۔ اورنگ آبادی مسجد میں بدعتی وہابی اختلاف تو تھا ہی، خود وہابی کہلوانے والے خاندان میں بھی اختلاف تھا۔ اختلاف کرنے والے مولوی عبدالخالق کا بیٹا اور داماد تھے۔ تفصیل نذیر احمد خود ہی بیان کرتے ہیں:

"اُس وقت رئیس خاندان دو تھے، مولوی نذیر حسین صاحب جن کا حال میں انتقال ہوا ہے اور میرے سسر مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم اور خیر خواہی میں بھی ان دونوں کا نام تھا، باوجودے کہ دونوں میں سالے بہنوئی کا رشتہ بھی تھا، اس پر بھی دونوں میں اختلاف ہوا اور خیر خواہی کا انعام یہ ملا کہ جنرل بخت خاں باغی نے مولویوں سے زبردستی جہاد کے فتوے پر مہریں کرائی تھیں۔ اگر یہ خیر خواہی نہ ہوتی تو ان کو پھانسی ملتی۔ انھوں نے میم کی جان بچائی، سرکار نے ان کی جان بخشی فرمائی۔ میں نے جو یہ پھوٹ دیکھی، بحالی کا حکم لے الٰہ آباد میں جا کر دم لیا۔"(۱۸)

نذیر احمد کے اس بیان سے واضح ہو رہا ہے کہ وہ سرکار سے بہت کچھ حاصل کرنے کی آس لگائے ہوئے تھے۔ اس لیے انھوں نے غدر کے بعد انگریزی سیکھی، سرکار کی خیر خواہی کی، سرکار کی خوش نودی کے حصول کی ہمیشہ کوشش کی۔ آخر کو وہ حیدر آباد میں بڑے عہدے پر فائز ہوئے اور بہت کچھ حاصل کیا۔

نذیر احمد نے دینی تعلیم حاصل کی، دہلی کالج میں رہ کر علومِ عربیہ میں درک پیدا کیا، مگر وہ مستقلاً علومِ دینیہ کی تدریس کی مسند پر نہ بیٹھے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ مولویت کی دکان چلانا نہیں چاہتے تھے۔ در اصل وہ مسجد اورنگ آبادی کی طالب علمی کے باعث مولویت سے خاصے بے زار ہو گئے تھے۔ وہ اپنے اساتذہ میں سے مولوی نصر اللہ خاں کے مداح تھے، جو ڈپٹی کلیکٹر تھے۔

وہ دلی کالج کے اساتذہ کے مداح تھے، تو وہ بھی سرکاری ملازم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نذیر احمد نے سرکاری ملازمت کو اپنا مطمحِ نظر بنایا۔

نذیر احمد جن دنوں دہلی کالج میں زیرِ تعلیم تھے، کالج کے ایک اُستاد ماسٹر رام چندر (۱۸۲۱۔۱۸۸۰ء) نے اصطباغ لے کر عیسائیت اختیار کر لی۔ وہ دینِ مسیحی میں کیا داخل ہوئے، کیا اُستاد اور کیا طالب علم، ہر کوئی مذہبی بحث مباحثہ کرنے لگا۔ اس بحث مباحثے سے نذیر احمد اتنے متاثر تو نہ ہوئے کہ وہ مسیحیت اختیار کر لیتے، مگر تشکیک میں ضرور مبتلا ہو گئے۔ اس واقعے سے متعلق وہ اپنے زیرِ نظر لیکچر میں بیان کرتے ہیں:

> "ماسٹر رام چندر صاحب جو ذات کے کائستھ تھے، جنھوں نے کتاب۔۔۔ تصنیف کر کے تمام یورپ میں اپنی ریاضی دانی کا سکہ بٹھا دیا تھا، اصطباغ لینے پر آمادہ ہوئے۔ وہ علمی سوسائٹی میں بڑے نامی نام ور آدمی تھے اور اُنھوں نے ڈنکے کی چوٹ عیسائی ہونا چاہا تو تمام شہر میں ڈھنڈورا سا پٹ گیا اور جا بہ جا مباحثے کی مجلسیں گرم ہو گئیں۔ عربی جماعتوں کے مولویوں نے اور طالب علموں کے ساتھ بھی آئے دن جھوڑ ہوتی رہتی تھی۔۔۔ بات کہوں صاف، سائنس کے زہر نے باوجودے کہ میں نے اس کو ذرا کی ذرا چکھا ہی تھا، میرے ایمان کو تو ڈانوا ڈول کر دیا تھا۔"(۱۹)

نذیر احمد مسجد اورنگ آبادی میں مولویت سے بے زار ہوئے اور دہلی کالج سے تشکیک لے کر نکلے۔ اس کی تفصیل وہ ایک اور لیکچر میں بھی بیان کرتے ہیں:

> "ماسٹر نے تو مجھ کو گم راہ کر دیا ہوتا مگر مجھ کو ادبِ عربی کا تھا شوق بہت۔ میں قرآن کی عبارت پر لٹو تھا۔ اس تریاق نے مجھ کو اس زہر سے بچایا، یہاں تک کہ میں کالج سے اپنا ایمان سلامت لے کے نکل گیا، مگر کیسا ایمان متزلزل، متشکک، ضعیف، مضمحل۔"(۲۰)

نذیر احمد عمر بھر ان سوالوں کا سامنا کرتے رہے۔ چناں چہ انھوں نے اپنے ناولوں میں ان سوالات اور اعتراضات کے جواب دیے جیسے انھوں نے اپنے آخری ناول **رویائے صادقہ** میں ان کا جواب دیا، اس کے علاوہ ان کی کتاب **اجتہاد** (مطبوعہ ۱۹۰۷ء،۱۹۰۸ء) میں ان سوالوں کا جواب موجود ہے۔ اس کتاب کا موضوع فقہی اجتہاد نہیں، فکری اجتہاد ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ میں کیوں مسلمان ہوں۔ نذیر احمد کے بہت سے لیکچرز کا موضوع بھی اسلام کی حقانیت ہے۔ گویا دہلی کالج کے سوالات ان کی زندگی میں اس قدر اہم تھے کہ وہ عمر بھر ان کے جوابات دیتے رہے۔ ظاہر ہے ان

کا یہی مقصد تھا کہ مسلمان نوجوان جب سائنس اور مسیحیت کے اعتراضات اور سوالات کا سامنا کریں تو انھیں نذیر احمد کی کتابوں سے اطمینان بخش جوابات میسر آسکیں۔

نذیر احمد نے دہلی کالج سے فراغت حاصل کی تو اپنے مائنڈ سیٹ کے باعث سرکار کی ملازمت کے امیدوار ہوئے۔ اچانک انھیں کنجاہ کے پرائمری مدرسے میں ملازمت مل گئی۔

> ”حسنِ اتفاق سے میری طالب علمی ختم ہونے ہی کو تھی کہ ضلع گجرات پنجاب میں تمہید کے طور پر چھے سکول کھولے گئے اور مدرس دہلی کالج سے طلب ہوئے۔ کنجاہ پہنچ کر میں نے مدرسے کی بنیاد ڈالی اور منت خوشامد سے چند ابجد خواں لڑکے جمع کیے، مگر میں اپنی قسمت کو روتا تھا کہ الٰہی اتنا پڑھ کر یہی حرف شناس منڈے میری تقدیر کے تھے۔۔۔ بارے ایک دم سے دو آفر آئے۔ اجمیر کالج کی سو روپے کی عربی مدرسی اور کان پور کی اسی روپے کی ڈپٹی انسپکٹری۔ میں نے آئندہ کی توقعات کے لحاظ سے ڈپٹی انسپکٹری قبول کر لی۔“(۲۱)

وہ کان پور میں ڈپٹی انسپکٹری کر رہے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا محاربہ برپا ہو گیا۔ اس کے بعد وہ دہلی چلے گئے۔ جب امن ہو گیا تو وہ بحالی کے احکام لے کر الٰہ آباد چلے گئے، جہاں انھوں نے انگریزی سیکھی۔ اب آئندہ کی ترقی کا ذریعہ ہوئے میر ناصر علی ذوالقدر (۱۸۴۷۔۱۹۳۳ء)۔ اُن دنوں الٰہ آباد میں اول درجے کے ڈپٹی کلیکٹر تھے۔ ریونیو بورڈ کے سینئر ممبر سر ولیم میور (۱۸۱۹۔۱۹۰۵ء) نے ان سے کہا کہ انکم ٹیکس ایکٹ کا اردو ترجمہ کریں۔ انھوں نے عذر کیا، وہ تو انگریزی جانتے نہیں، ساتھ ہی یہ بتا دیا، مولوی نذیر احمد انگریزی خوب جانتے ہیں۔ ولیم میور نے انھیں طلب کیا اور انکم ٹیکس ایکٹ دے کر ایک باب کا ترجمہ کرنے کا کہا۔ یہ ترجمہ پسند کیا گیا اور انھیں اپنے سرکاری کام سے فارغ کر کے ترجمے کے کام کے لیے خاص کر دیا گیا۔ ان کے افسر بابو شیو پرشاد تھے، مگر اب یہ لُو (Love) صاحب کے زیرِ نگرانی ترجمہ کرنے لگے اور ایسی کام یابی سے کرنے لگے کہ لُو صاحب نہ کہیں انگلی رکھتے، نہ کوئی تبدیلی کرتے۔ اس ترجمے سے نذیر احمد کو کیا فوائد حاصل ہوئے، وہ لکھتے ہیں:

> ”میری انگریزی کو اس سے بہت فائدہ پہنچا اور اب مجھ کو عربی کی بھی قدر آئی۔ یا تو انکم ٹیکس ایکٹ کے ترجمے کا نام سُن کر میرے حواس باختہ ہو گئے تھے یا اب ایسا ہواؤ کھلا کہ میں نے لُو صاحب سے مانگ کر بورڈ کے کئی سرکلر ترجمے کیے اور میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ ترجمے کی جنتری میں سے نکل کر میری اُردو کی تحریر بھی ٹھیک ہو گئی ہے اور مجھ کو لفاظی اور قافیہ بندی

اور مبالغہ اور استعارات اور تشبیہات کے بہ دون سادہ سلیس شگفتہ عبارت میں ادائے مطلب کا ڈھنگ آ گیا۔"(۲۲)

نذیر احمد کے لیکچر کا یہ اقتباس بہت اہم ہے۔اس میں انھوں نے تین باتیں کہی ہیں۔ایک تو یہ، ان کی انگریزی بہتر ہو گئی۔ظاہر ہے کہ ترجمے میں ایک ایک جملے بل کہ ایک ایک لفظ کے معنوں اور معنویت کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ انگریزی عبارت کو پوری طرح سمجھنے پر قادر ہو گئے۔دوسرے ان کی عربی بہت کام آئی۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے ترجمے میں بہت سی اصطلاحات عربی سے گھڑی گئیں۔تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ نذیر احمد اس سے قبل سادہ، سلیس اور شگفتہ اردو لکھنے پر قدرت نہیں رکھتے، بل کہ تصنع آمیز مقفیٰ، مسجع اور مصنوعی انداز میں اردو لکھتے تھے۔ قانونی عبارتوں کا اُردو ترجمہ کرتے ہوئے انھیں احساس ہوا کہ سادہ اور سلیس زبان میں لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جانا چاہیے۔ اس طرح انھیں نہ صرف انگریزی زبان و بیان کی تفہیم پر قدرت حاصل ہوئی، انھیں اُردو لکھنے کا سلیقہ میسر آیا۔یہی سلیقہ تھا جس نے انھیں صاحبِ اسلوب نثر نگار بنا دیا۔ ڈپٹی صاحب کو قانونی کتابوں کے ترجمے نے صاحبِ اسلوب بنایا تھا۔جیسے الطاف حسین حالی (۱۸۳۷۔۱۹۱۴ء) کو گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب کی ملازمت میں انگریزی کتابوں کے اُردو ترجمے کی اصلاح نے صاحبِ اسلوب نثر نگار بنا دیا۔

نذیر احمد نے انکم ٹیکس ایکٹ کا ترجمہ کیا کیا، انھیں ترجمہ کرنا بھی آ گیا، ترجمے کا شوق بھی پیدا ہو گیا، ساتھ ہی ساتھ انھیں نثر لکھنے کا سلیقہ آ گیا۔اب جو شوق پیدا ہوا تو انھوں نے تعزیراتِ ہند کے ترجمے میں کسی نہ کسی طرح خود کو شریک کر لیا، تفصیل انھوں نے لیکچر میں خود ہی بتا دی ہے۔وہ ترجمے میں پہلے شریک ہوئے، پھر شریکِ غالب۔ترجمہ مکمل ہوا تو دوسرے ساتھیوں کے ساتھ پانچ چھے سو کی گھڑی کا تحفہ سرکار سے ملا جس کے ڈھکنے پر اُن کا نام ولایت سے کندہ ہو کر آیا۔ کیا اعزاز تھا کہ نو آبادی کے باسی نذیر احمد اس تحفے اور نام کندہ ہونے کا ذکر بھولے نہیں، شوق سے بیان کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اُن کا نام ڈپٹی کلیکٹری کے لیے نام زد ہوا۔

نذیر احمد ڈپٹی کلیکٹری کے منتظر تھے کہ انکم ٹیکس ایکٹ میں ترجمے کے نگران لُو صاحب نے انھیں تحصیل دار لگا دیا۔ انھوں نے خوب محنت سے فرائض منصبی بھی ادا کیے اور ڈپٹی کلیکٹری کے امتحان

کی تیاری بھی کی۔ امتحان دے چکے تو فارغ تھے۔ ان کے شوقِ ترقی نے ایک اور کام ڈھونڈ نکالا۔ تفصیل اس کام کی نذیر احمد یوں بیان کرتے ہیں:

> ”ان ہی دنوں ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۸۶۱ء کا اُردو ترجمہ ضابطۂ فوج داری گورنمنٹ گزٹ میں شائع ہوا۔ باوجودے کہ ضابطہ گویا قانونِ ہند کا ضمیمہ تھا، چاہیے تھا کہ تعزیراتِ ہند کی طرح ہم لوگ ضابطے کا بھی ترجمہ کرتے، مگر کسی کو اس کا خیال نہ آیا اور مسٹر ولسن مترجم گزٹ نے اپنے طور پر بلالحاظ تعزیراتِ ہند ضابطے کا ترجمہ کر میرے شیر نے گزٹ میں چھپوا بھی دیا تو تعزیراتِ ہند اور ضابطے میں اختلاف ہوا ہی چاہے اور ہوا بھی۔“(۲۳)

ڈپٹی صاحب نے انھی ناصر علی ذوالقدر کی معرفت حکومت کو اس اختلاف سے آگاہ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا ترجمہ نذیر احمد کو کرنا پڑا۔ تحصیل داری کے منصب پر رہتے ہوئے ضابطے کا ترجمہ کیا۔ وہ دو سال تک اس منصب پر رہے، پھر ڈپٹی کلیکٹر بنا دیے گئے۔ اس کے بعد اُن کی ادبی و علمی تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابتدا تین کتابوں سے ہوئی یعنی **مراۃ العروس**، **منتخب الحکایات** اور **چند پند**۔ یہ کتابیں اتفاق سے کیمپسن صاحب ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کی نظر میں آ گئیں۔ **مراۃ العروس** پر انھیں سرکار سے انعام ملا اور ٹائم پیس بھی۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ بنات **النعش** اور **توبتہ النصوح** پر بھی انعام ملے۔ اس کے بعد اُن کا سلسلۂ تصنیف تمام عمر چلتا رہا۔ اُنھوں نے اپنے بچوں کی تدریس کے لیے **مراۃ العروس**، **منتخب الحکایات** اور **چند پند** لکھی تھیں۔ بعد میں اُنھوں نے صرف و نحو اور منطق میں تین کتابیں مرتب کیں۔ صَرف میں **مایغنیك فی الصرف** اور نحو میں **مایغنیك فی النحو**۔ اول الذکر کتاب شائع ہوئی مگر مولویوں نے اسے نصاب میں شامل کرنے کی مخالفت کی۔ **مایغنیك فی النحو** مولوی نذیر احمد کے صاحب زادے بشیر الدین احمد کے یہ قول:

> ”یہ کتاب مولوی علی احمد برادرِ اکبر مولوی نذیر احمد صاحب نے میرے والد ماجد مرحوم و مغفور کی فرمائش پر لکھی تھی، جس کا نام انھوں نے **توضیح المرام** رکھا تھا اور میں نے سبقاً سبقاً پڑھی تھی۔“(۲۴)

نذیر احمد نے اس کتاب کو اپنی تالیف ٹھہرایا ہے جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ یہ کتاب نہ چھپی، نہ مصنف کی بحث کچھ مفید ہے۔ تیسری کتاب منطق پر لکھی گئی جس کا نام **مبادی الحکمہ** رکھا گیا۔ یہ کتاب کلکتہ یونیورسٹی نے اپنے نصاب میں شامل کی۔

نذیر احمد نے اعظم گڑھ میں اپنی ملازمت کے دوران علمِ ہیئت کی کتاب کا ترجمہ کیا۔ اس کے ساتھ ایک عجیب جھگڑا پیدا ہوا۔ یہ کتاب علم ہیئت پر تھی اور بہت دل چسپ تھی۔ یہ اولاً فرانسیسی میں لکھی گئی۔ اس کا ترجمہ جرمن زبان میں ہوا، پھر انگریزی میں ہوا۔ افسرانِ بالا نے نذیر احمد کو اس کا ترجمہ کرنے کے لیے کہا۔ انھوں نے ترجمہ کر دیا، جو ماہرینِ فن کی کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں اسے قابلِ اصلاح ٹھہرایا گیا اور ہزار میں سے چار سو کے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ کتاب بہت اہم تھی۔ اس ترجمے پر سرکاری کارروائی جاری رہی۔ آخر کو یہ حیدر آباد میں نواب سالار جنگ (۱۸۶۲۔۱۸۸۹ء) کو نظر ثانی کے لیے بھیجی گئی۔ انھوں نے سید حسین بلگرامی (۱۸۴۶۔۱۹۲۲ء) کے حوالے کی۔ سید حسین نے ترجمہ پڑھا تو انھیں بہت پسند آیا۔ انھوں نے ڈپٹی صاحب کو ہی یہ ترجمہ نظر ثانی کے لیے ارسال کر دیا۔ نذیر احمد لکھتے ہیں:

> "مولوی سید حسین کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ تمھارا ترجمہ مجھ کو سپرد ہوا ہے۔۔۔ ترجمہ بہتر سے بہتر ہُوا ہے اور اس میں کچھ کسر ہے تو اسی قدر کہ تم ہی اس کی نظر ثانی کرو اور جہاں ضرورت دیکھو، اصلاح کر لو۔"(۲۵)

یہ کتاب آخر کو چھپ بھی گئی، نذیر احمد کو اس کے انعام میں پہلے صرف چار سو ملے تھے، مولوی سید حسین کے تبصرے کے بعد چھے سو بھی ادا کر دیے، مگر یہ کتاب آئندہ ترقی کا وسیلہ بن گئی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اِدھر اُن کا تبادلہ اعظم گڑھ سے ہُوا، اُدھر اُنھیں حیدر آباد دکن سے نئی ملازمت کا آفر مل گیا۔ نواب سالار جنگ نے انھیں حیدر آباد بلا لیا۔ یہ واقعہ ۱۸۷۷ء کا ہے۔ حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں انھوں نے کوئی بڑا تصنیفی کام تو نہیں کیا، مگر یہ وہاں رہ کر حفظ القرآن کی دولت سے بہرہ ور ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "سر سالار جنگ کے حکم سے میں نے ایڈمنسٹریشن پر چند رسالے حضور پُر نور کے ملاحظہ کے لیے تصنیف کیے۔ اور ایک بہت بڑا کام یہ کہ بدون اس کے کہ کارِ سرکار میں کسی طرح کا فتور واقع ہو، چھے مہینے سترہ دن میں قرآن حفظ کر لیا۔"(۲۶)

بشیر الدین احمد حاشیے میں لکھتے ہیں کہ یہ چھے رسالے تھے اور اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں (۱۸۶۶۔۱۹۱۱ء) کے ملاحظے سے گزرے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ نذیر احمد کو چار سو ماہانہ پنشن اپنی ملازمت کی ملی اور دو سو روپیہ پنشن ان رسالوں کی تصنیف کے عوض ملی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دکن کے اعلیٰ حضرت نظام اور اُن کے کارپرداز کس قدر علم دوست تھے۔

نذیر احمد کو جب حیدر آباد بلایا گیا تو یقیناً اُنھیں اپنی علمی خدمات کی بنا پر بلایا گیا تھا۔ وہاں انھیں اس قدر بیش قرار تنخواہ دی گئی کہ بہ قول ان کے مر کر دوبارہ بھی جنم لیتا تو نصیب نہ ہوتی۔ اس پر مستزاد یہ کہ نواب سالار جنگ اُن کی بے حد قدر دانی فرماتے تھے۔ اسی لیے نواب سالار جنگ کی وفات کے ساتھ ہی نذیر احمد وظیفہ یاب ہو کر گھر آ بیٹھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد ان کے سبھی آوردوں کے پائے ثبات لڑکھڑا اُٹھے اور جو سب سے پہلے بھاگ کھڑا ہوا وہ میں تھا۔ حیدر آباد کے ساتھ میں نے نوکری کے پیشے ہی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا، کسی کی بھی ہو۔ اور سرکار عالی سے وظیفہ لیے مزے سے گھر آ بیٹھا۔"(۲۷)

اس اقتباس سے یہ بات متبادر ہوتی ہے کہ نوابی ریاستوں میں سرکاری نظم کس قدر کم زور تھا۔ ریاست کے ملازمیں اپنے سرپرست درباریوں اور حواریوں کی سرپرستی کے بغیر نوکری غیر محفوظ سمجھتے تھے۔ دکن کے نظام البتہ فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ وہاں سے جب کوئی رخصت ہوتا تو عمر بھر سرکارِ عالی کے وظیفے سے متمتع ہوتا۔

نذیر احمد ۱۸۸۴ء میں وظیفہ یاب ہو کر دہلی آ بیٹھے۔ اس کے بعد وہ تصنیف و تالیف میں مگن رہے۔ اُنھوں نے تین ناول **ابن الوقت**، **محصنات** (فسانۂ مبتلا) اور **رویائے صادقہ** لکھے۔ ایک بڑا کام یہ کیا کہ قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ پہلے تو وہ "ترجمۂ قرآن" کے نام سے ہی کان کو ہاتھ لگاتے تھے۔ ویسے بھی حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحب زادوں کے ایک کیا دو ترجمے موجود تھے۔ پھر یہ ایک بڑا کام تھا اور اس میں بڑی آزمائش تھی، مگر ایک واقعہ ایسا ہوا کہ یہ ترجمۂ قرآن کرنے لیے آمادہ ہو گئے۔ واقعہ وہ یوں سناتے ہیں:

> "حدیث پڑھتے پڑھتے اک کتاب میری نظر سے گزری **تیسیر الوصول الیٰ جامع الاصول فی احادیث الرسول** میں تو اس کتاب کو دیکھ کر پھڑک گیا کہ صاحبِ کتاب نے حقیقت میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا یا چنے کی دال پر قُل ھو اللہ کندہ کر دی۔ یعنی مجموعہ صحاح ستہ کو ایک جلد میں جمع کر دیا اور وہ صحاح ستہ کی چھے کتابوں میں ہر ایک کتاب سے ضخامت میں چھوٹی اور مزہ یہ کہ اختلافاتِ لفظی میں سے زیر زبر تک کے اختلاف تک کو نہیں چھوڑا۔"(۲۸)

نذیر احمد نے اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ کتاب التفسیر تک پہنچے تو آیات کا ترجمہ ایک مسئلہ بن گیا۔ کوئی دوسرا ترجمہ شامل کرتے ہیں تو اسلوب مختلف ہے، خود کرتے ہمت نہیں پڑتی۔ آخر ہمت کر کے ترجمہ شروع کیا۔ حوصلہ ہوا اور پورے قرآن مجید کا ترجمہ ہو گیا۔ نذیر احمد ترجمۂ قرآن کا پس منظر بیان کرنے کے بعد ترجمے کی تفصیل وغیرہ بیان کرتے ہیں، مگر یہ نہیں بتاتے کہ **تیسیر الاصول** کے ترجمے کا کیا ہوا۔ اُن کے سوانح نگار بھی تفصیل نہیں بتاتے۔ بہ ہر حال یہ واضح ہے کہ انھوں نے **تیسیر الاصول کا** ترجمہ کم از کم کتاب التفسیر تک یقیناً کیا تھا۔

نذیر احمد نے اپنی ریٹائرمنٹ (۱۸۸۴ء) کے بعد لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اُن کے لیکچروں کے مجموعے کی جلد اوّل میں پہلا لیکچر ۱۸۸۸ء کا ہے، جب کہ جلد دوم میں آخری لیکچر ۱۹۰۵ء کا ہے۔ گویا وہ سترہ سال لیکچر پیش کرتے رہے۔ ان لیکچرز میں اُن کے سیاسی، تعلیمی اور ادبی نظریات کے ساتھ دینی نظریات بھی ملتے ہیں۔ بعض لیکچرز کا موضوع علمِ کلام ہے۔ انھیں خود بھی اندازہ ہے کہ اُن کے لیکچرز کی کیا اہمیت ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ وہ اپنے لیکچرز میں قرآن کے حقائق و بصائر بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”میری عمر کا کوئی بڑا حصہ قرآن سے بے تعلقی کا نہیں گزرا۔۔۔ فہم معنی قرآن کو بھی ایک عمر گزری، مگر ترجمہ کرتے وقت مجھ پر ایسے حقائق منکشف ہوئے جن کی طرف پہلے کبھی ذہن منتقل نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے بعض حقائق میں نے لیکچروں میں ظاہر کیے ہیں اور بعض کے اظہار کو ملتوی رکھا ہے، اس لیے کہ عام لوگوں کے اذہان ابھی ان کے متحمل نہیں۔“(۲۹)

نذیر احمد نے ۱۸۹۰ء میں ”اثباتِ اصولِ اسلام“ اور ”۱۸۹۳ء میں فطرۃ اللہ“ کے عنوان سے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں تقریریں کیں۔ اسی طرح انھوں نے دیگر لیکچرز میں قرآنی نکات بیان کیے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۰۷ء میں **اجتہاد** کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کا موضوع فقہی اجتہاد نہیں، فکری اجتہاد ہے۔ اس کتاب کو علمِ کلام میں ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔

نذیر احمد کی سوانح عمری میں اس لیکچر کو خاص اہمیت حاصل ہے، خصوصاً اُن کے تحصیلِ علم، ارتقائے فکر، ملازمت، اُن کے عہد کے تعلیمی نظام اور اُن کے تعلیمی نظریات کے بارے میں یہ لیکچر بہت اہم ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) افتخار احمد صدیقی، نذیر احمد کی یادگار تحریریں، مشمولہ ڈپٹی نذیر احمد: احوال و آثار، ترتیب و تدوین: محمد اکرم چغتائی، (لاہور: پاکستان رائیٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۳ء) ۴۵۹۔

(۲) نذیر احمد، لیکچروں کا مجموعہ، جلد دوم، مرتبہ: بشیر احمد (آگرہ: مفید عام سٹیم پریس ۱۹۱۸ء)، ۴۰۷۔

(۳) نذیر احمد، لیکچروں کا مجموعہ ، جلد دوم، ۴۰۱۔

(۴) ایضاً، ۴۱۲۔

(۵) ایضاً، ۴۱۵، ۴۱۶۔

(۶) رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، مرتبہ و مترجمہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری، (کراچی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۱ء) ۲۳۹، ۴۴۰۔

(۷) فرمان فتح پوری، اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۸ء) ۳۸۱، ۳۸۲۔

(۸) نذیر احمد، حوالہ مذکور، ۴۱۷۔

(۹) ایضاً، ۴۱۶۔

(۱۰) محمود احمد برکاتی، حکیم، حیات شاہ محمد اسحاق، (دہلی: شاہ ابوالخیر اکادمی، ۱۹۹۲ء) ۱۲۶۔

(۱۱) نسیم احمد فریدی، مفتی، کاروانِ اہلِ فضل و کمال، مشمولہ مقالات فریدی، جلد دوم، مرتبہ مولانا محب الحق، ۱۷۳۔

(۱۲) افتخار احمد صدیقی

(۱۳) اکرام چغتائی، دیباچہ، ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار، ۵۔

(۱۴) نذیر احمد، حوالہ مذکور، ۴۱۹۔

(۱۵) نذیر احمد، لیکچروں کا مجموعہ جلد اول، ۳۸۰، ۳۸۱۔

(۱۶) ایضاً، ۴۲۷، ۴۲۸۔

(۱۷) ایضاً، ۴۲۵، ۴۳۶۔

(۱۸) ایضاً، ۴۲۶۔

(۱۹) ایضاً ۴۲۴، ۴۲۳۔

(۲۰) ایضاً، حصہ دوم، ۲۰۰۔

(۲۱) ایضاً، ۴۲۵۔

(۲۲) ایضاً، ۴۳۱، ۴۳۲۔

(۲۳) ایضاً، ۴۳۴۔

(۲۴) ایضاً، ۴۴۰۔

(۲۵) ایضاً، ۴۴۲۔

(۲۶) ایضاً، ۴۴۴، ۴۴۳۔

(۲۷) ایضاً، ۴۴۴۔

(۲۸) ایضاً، ۴۴۵۔

(۲۹) ایضاً، ۴۴۶۔

BIBLIOGRAPHY

- Deputy Nazir Ahmad, *Lekcharūn ka Majmu‘a*, (Compl.)Bashir Din Ahmad. Agra: Mufeed-e Aam Steam Press. 1918
- Farman Fateh Puri, *Urdū Shu’rā ka Tazkiray aur Tazkirah Nigari*, (Karachi: Anjuman-eTaraqqi-i Urdu.1998)
- Iftkhar Ahmad Siddiqi, *Deputy Nazīr Aḥmad*, (Compl.) M. Ikram Chaghatai. Lahore: Pakistan Writers Cooperative Society. 2013
- Mehmood Ahmad Barkati, Ḥ*ayāt Shah Muḥammad Isḥaq*, Delhi: Shah Abualkhair Academy. 1992
- Naseem Ahmad Faridi, *Karvān-e Ahl-e Fazl-o Kamāl*, (Incl.) Maqalat-e Faridi, Vol. 2, Murataba: Maulana Muhibbul Haq.
- Rahman Ali, *Tazkira-e Ulama-e Hind*, (Trans.) Karachi: Pakistan Historical Society. 1961

❖❖❖